

باب 9 بعثت اور دعوت دین کا آغاز

اہم مضامین (تصورات)

1. آغاز وحی
2. کیفیت وحی
3. دعوت کا آغاز
4. دعوت کو برداشت کرنے کا دور
5. قریش کو اذار کا حکم

آغاز وحی

صحابہ کے زمانہ میں ہی سوال پیدا ہوا کہ نبی ﷺ پر کونسی آیات سب سے پہلے نازل ہوئیں۔ بعض لوگ سورہ العلق کی ابتدائی آیات کو پہلی وحی مانتے تھے۔ لیکن جابر بن عبد اللہ کو اصرار تھا کہ میں نے بطور خاص خود حضرت ﷺ سے سوال کیا تو آپ نے فرمایا کہ سورہ المدثر کی ابتدائی آیات سب سے پہلے نازل ہوئیں۔ حضور ﷺ نے بتایا کہ میں حسب معمول غار حرا میں ایک ماہ مقیم رہا۔ جب یہ مدت ختم ہوئی تو میں پہاڑ سے اترآ۔ وادی میں مجھے یوں لگا کہ کسی نے مجھے پکارا ہے۔ میں نے آگے پیچھے اور دائیں بائیں مڑ کر دیکھا لیکن کوئی شخص نظر نہ آیا۔ پھر ندا آئی تو میں نے سر اٹھایا کیا دیکھتا ہوں کہ وہی فرشتہ جو غار حرا میں میرے پاس آیا تھا ہوا میں ایک تخت پر پورے شکوہ کے ساتھ بیٹھا ہے۔ اس منظر سے میرے جسم میں کپکپی طاری ہو گئی۔ چنانچہ میں گھر کولوٹا اور کہا کہ مجھے چادر اوڑھ دو۔ بعض روایات میں ہے فرشتہ افق سے اترنے لگا اور مجھ سے اتنا قریب ہو گیا جتنا استاد اپنے شاگرد سے قریب ہوتا ہے۔ تب اس نے جھک کر پورے التفات و اہتمام کے ساتھ وحی پہنچائی۔ ہمارے نزدیک یہی موقع ہے جب حضور کو خلعت رسالت سے نوازا گیا۔ اس واقعہ کا ذکر قرآن نے بھی بڑے اہتمام سے کیا ہے اور بتایا ہے کہ فرشتہ کو دیکھنا اور اس سے وحی حاصل کرنا ایک ایسا معاملہ تھا جس میں آپ کے واہمہ یا تخلیق کا کوئی دخل نہ تھا۔ آپ کی عقل وفہم نے وحی کے پیغام کو سمجھنے میں ذرا بھی غلطی

نہیں کی۔ فرشتہ نے اس موقع پر اللہ کا وہ پیغام پہنچایا جو اس موقع پر آپ کو پہنچانا مقصود تھا۔ اس کے بعد وحی کا سلسلہ باقاعدہ جاری ہو گیا۔ رہی یہ بات کہ پہلی وحی کن آیات پر مشتمل تھی تو اس بارے میں متعین طور پر کچھ کہنا مشکل ہے۔ تاہم اگر حضرت جابرؓ کی روایت پر انحصار کیا جائے تو پہلی وحی یوں تھی:

" اے چادر اُرنے والے اوٹ اور لوگوں کو خبردار کر اپنے رب کی بڑائی بیان کر اپنے دامن کو پاک رکھ اور ناپاکی سے دور رہ " (المدثر، آیات 1 تا 5)

ہمارے نزدیک یہ آیات ایسی ہیں جو وہی کا نقطہ آغازین سکتی ہیں۔ ان میں نبی ﷺ کو ذمہ داری سے گھبرا کر چادر میں لپٹ جانے کے بجائے اٹھ کر لوگوں کا سامنا کرنے ، ان کے آگے صرف اللہ کی کبریائی کا چرچا کرنے اور شرک کی نجاست سے دور رہنے کی تلقین ہے۔ ان میں نبی کی اصل ذمہ داری انذار کا واضح ذکر موجود ہے۔ جس کا مطلب ہے لوگوں کو اللہ کی ہدایت کی طرف بلانا اور اگر وہ اس کو قبول نہ کریں تو اس کے برے نتائج سے خبردار کرنا اور ڈرانا۔ پہلی وحی حضور ﷺ پر ماہ رمضان میں لیلة القدر میں نازل ہوئی۔ یہ بات قرآن مجید کی نص سے ثابت ہے۔ یہ بات بھی ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کے اہم امور کے لیے یہ رات مخصوص کی ہوئی ہے اور نزول قرآن چونکہ انسانیت کی بھلائی کے لیے سب سے اہم پروگرام تھا اس لیے ہزار ماہ سے بھی زیادہ قیمتی رات لیلة القدر میں اس کا اہتمام فرمایا گیا۔ مزید انتظام یہ کیا گیا کہ جبریل امین کو بارگاہ خداوندی سے رسول اللہ تک وحی پہنچانے میں جو شیطانی قوتیں خصوصاً جنات، مزاحم ہوسکتی تھیں ان کی افلاک میں آمدورفت کو روکنے کے لیے پہرے لگا دیے گئے۔

چونکہ فرشتہ وحی کی پہلی آمد، جو روشناسی کے مقصد سے تھی، اور دوسری آمد میں، جو فی الواقع حضور کی بعثت کی خبر دینے کے لیے تھی، چند ہفتوں کا وقفہ تھا اس کو فترۃ الوحی سے تعبیر کر لیا گیا اور پھر اس کی مدت تین سال تک پھیلا دی گئی۔ حالانکہ کے قابل غور بات یہ ہے کہ اگر رسالت کے کام کو شروع کرانے کے بعد تین سال تک معطل ہی کرنا تھا تو اس کا آغاز کیوں کیا گیا۔ اس کی کوئی مصلحت تو ہونی چاہئے۔ ہمارے نزدیک حضرت جابر کی روایت مبنی برحقیقت ہے۔ وحی میں کوئی انقطاع نہیں ہوا۔ جب رسول اللہ مبعوث ہوئے تو پہلے دن ہی سے وحی کا آغاز ہو گیا اور آپ اس کی روشنی میں دعوت دین دینے لگے۔

کیفیت وحی

احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ وحی نازل ہونے سے پہلے آپ گھنٹی کی آواز سنتے یا آپ کو مکھیوں کی بھنبھناہٹ سے ملتی جلتی آواز سنائی دیتی۔ آپ اس کی طرف متوجہ ہو جاتے تو انہی آوازوں سے الفاظ وحی کی تراوش ہوتی۔ اس کیفیت میں آپ کا جسم پسینے سے شرابور ہو جاتا اور اعضا پر کپکپی تاری ہو جاتی طاری ہو جاتی۔ جب یہ کیفیت ختم ہوئی تو آپ کے ذہن میں وحی کے الفاظ محفوظ ہو چکے ہوتے تھے۔

نبی ﷺ کے جسم پر نمی طاری ہونے والی یہ کیفیات دیکھنے والوں کو نظر آتی لیکن نبی کے باطن میں کیا ہو رہا ہوتا اس کو جاننے کا کسی کے پاس کوئی ذریعہ نہ تھا۔ یہ رسول اللہ ﷺ اور جبریل امین کے درمیان کا معاملہ ہوتا۔ گھنٹی کی آواز یا بھنبھناہٹ بھی صرف حضور ﷺ ہی سنتے۔ آپ کے ساتھی اس سے بے خبر ہوتے۔ ہوسکتا ہے یہ آواز آپ کو متوجہ کرنے کے لیے آتی ہو اور اس وقت تک جاری رہتی ہو جب تک پیغام وحی مکمل نہ ہو جاتا ہو۔ جہاں تک جسمانی تغیرات کا تعلق ہے یہ اس لیے واقع ہوتے کہ رسول اللہ کا رابطہ عالم ناسوت سے نکل کر عالم لاہوت میں فرشتہ کے ساتھ ہوتا۔ آپ کو اس میں غیر معمولی مشقت پیش آتی۔ اس کیفیت کو بدطینت مستشرقین نے العیاذ باللہ مرگی کے دورہ کا نام دیا ہے جبکہ مرگی کا مریض دورہ پڑنے پر بے ہوش ہو کر گر پڑتا ہے اور اس کے لیے دورہ کی کیفیت ہے نکلنے کے بعد ڈھنگ سے باتیں کرنا بھی ممکن نہیں ہوتا۔ پیغمبر وحی اترنے کی حالت میں بیہوش نہیں ہوتے تھے۔ اس کیفیت سے نکلنے کے بعد زندگی بخش معجز کلام آپ کی زبان سے ادا ہوتا اور آپ فوراً اس کی رہنمائی میں ساتھیوں کو نئی ہدایات دیتے اور پیش آمدہ مسائل کو حل فرماتے۔ وحی آپ کے لیے قوت اور تسکین کا باعث بنتی اور آپ کو اپنے کام کے لیے ولولہ تازہ مہیا کرتی۔ وحی شدہ کلام آپ اپنے دوست و دشمن، حلیف و حریف سب کو گوش گزار کرنے پر مامور تھے۔ اس لیے آپ کوئی نئی وحی نازل ہونے کا انتظار رہتا۔

دعوت کا آغاز

جب کسی قوم کے اندر رسول کی بعثت ہوتی ہے تو وہ اس قوم کو مخاطب کر کے اللہ کا یہ پیغام دیتا ہے کہ لوگ اپنے غلط عقیدہ و عمل کو چھوڑ کر اللہ کے بندے بن جائیں۔ اس مقصد کے لیے وہ لوگوں کی فطری نیکی کو ابھارتا، غلط کاموں پر متنبہ کرتا نصیحت و موعظت کے ذریعے ان کو خدا کی بتائی ہوئی راہ راست کو اختیار کرنے کی تلقین کرتا اور قوم کی فقری و عملی رہنمائی کرتا ہے۔ ان میں سے کوئی کام خفیہ کرنے کا نہیں ہوتا۔ رسول کی ذمہ داری کی نوعیت سازش کر کے انقلاب برپا کرنے کی نہیں ہوتی کہ وہ

اپنی جدوجہد کو لوگوں کی نظروں سے چھپا کر رکھے اور اپنی جماعت کھڑی کر کے ایسے افراد مہیا کرے جو قوم کے اندر رائج نظام کو تلپٹ کر کے اس کے تجویز کردہ نظام کو نافذ کر دیں۔ رسول کے کام کی نوعیت ہی کا یہ تقاضا ہوتا ہے کہ اگر وہ اس بات کا آرزو مند ہو کہ ساری قوم اس کی آواز پر لبیک کہے دے لیکن عملاً اس کو اس بات کی زیادہ پروا نہیں ہوتی کہ اس کا ساتھ دینے والے کون اور کس حیثیت کے مالک ہیں۔ وہ کل کتنے تھے اور آج انکی تعداد کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض رسولوں پر ایمان لانے والے چند ہی افراد ہوئے، باقی ساری قوم نے اُن کا انکار کیا، تاہم رسول اپنا فریضہ ادا کرنے میں کامران ہوئے۔

رسول دین کی دعوت اپنی کسی غرض کو پورا کرنے کے لیے نہیں دے رہا ہوتا ہے۔ یہ ذمہ داری مالک ارض و سما اُس کے سپرد کرتا ہے۔ جو اس کو کام کرنے کا پلان بھی عطا کرتا ہے۔ پیغمبر اسی پلان کی حدود میں رہ کر کام کرتا ہے اور جب اس کا قدم ان حدود سے باہر جانے لگتا ہے تو اللہ تعالیٰ رہنمائی کرتا اور اس کو واپس پلان کی حدود میں لے آتا ہے۔ چونکہ پیغمبر کا کام جان و جوکھم میں ڈالنے کا ہوتا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ اس کی حفاظت کا ذمہ بھی لیتا ہے۔ مشکل وقت میں وہی اس کی دستگیری فرماتا ہے۔ لہذا رسول کو کسی بھی مرحلے پر اپنی قوم کے کی سخت ردعمل سے گھبرانے کی ضرورت نہیں ہوتی کہ وہ اپنی دعوت کو خفیہ رکھنے پر مجبور ہو۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب مصر میں تھے تو ان کے ہاتھوں قبتی کے قتل کا واقعہ پیش آیا جس میں ان کے ارادہ کو کوئی دخل نہ تھا۔ چونکہ فرعون کو بنی اسرائیل سے بیر تھا اس لیے موسیٰ علیہ السلام کو اس کا ذمہ دار کروایا گیا۔ جب اللہ تعالیٰ نے ان کو منصب رسالت سے سرفراز فرمایا تو ساتھ ہی ان کو حکم ہوا کہ فرعون کے دربار میں جا کر میرا پیغام پہنچا دو، وہ بے حد سرکش ہو چکا ہے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ نے کوئی خفیہ منصوبہ تیار نہیں کیا بلکہ بے دہ رک فرعون کے پاس چلے گئے۔ فرعون نے ان کے پچھلے جر کا حوالہ دیا اور یہ امکان بھی تھا کہ وہ ان کو گرفتار کر لے مگر اللہ تعالیٰ کا ارشاد تھا

تم دونوں (یعنی موسیٰ و ہارون) اندیشہ مت کرو، میں تمہارے ساتھ ہوں، میں سنتا اور دیکھتا ہوں (طہ، 46:20)

یہ بات حیرت انگیز ہے کہ رسول الہ جیسے عظیم المرتبت خاتم الانبیاء کے بارے میں آپ کے سیرت نگاروں نے یہ تاثر کیسے پھیلا دیا اور اُمت نے اس کو قبول کیسے کر لیا کہ بعثت کے بعد تین سالوں تک آپ نے خفیہ تبلیغ کی۔ یہ بات رسولوں کی سنت سے مطابقت نہیں رکھتی اور حقائق کے بھی منافی ہے۔ اگر آپ نے قریش کی مخالفت کے خوف سے ایسا کیا تو کیا اللہ تعالیٰ کی وہ حفاظت آپ کو حاصل نہ تھی جو تمام رسولوں کو حاصل رہی ہے؟ یہ سوال بھی پیدا ہوا ہے کہ تین سالوں کے بعد جب آپ نے اعلان

تبلیغ شروع کی تو کیا اس وقت قریش کی عداوت ختم ہو چکی تھی؟ یا کیا اس عرصہ کے دوران میں آپ نے چوری چھپے اتنی نفری مہیا کر لی تھی کہ آپ قریش کے مد مقابل بن کر آسکتے؟ تاریخ گواہ ہے کہ ان میں سے کوئی بات بھی سہی نہیں ہے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ آنحضرت نے اس عرصہ میں دعوت کو لوگوں کے علم میں لانے میں رکاوٹ پیدا کی تو یہ اللہ تعالیٰ کی ڈالی ہوئی ذمہ داری کے ادا کرنے میں کوتاہی تھی جو حضور کی عظمت و شان کے منافی ہے۔ خفیہ تبلیغ کے کوئی اور حکمت سیرت نگار بیان نہیں کرتے۔ ہمارے نزدیک آپ کی جد و جہد کا کوئی دور خفیہ نہیں رہا۔ آپ نے دعوت دین کا کام اس پلان کے مطابق کیا جو آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیا گیا تھا اور اس میں ایک تدریج ملحوظ رکھنے کا حکم تھا۔ فرمایا گیا:

اور اپنے قریبی خاندان والوں کو دڑاؤ اور جن اہل ایمان نے تمہاری پیروی کی ہے، ان کے لیے اپنی شفقت کے بازو جھکائے رکھو، اگر لوگ تمہاری نا فرمانی کریں تو ان کو سنا دو کہ جو کچھ تم کر رہے ہو اُس سے میں بری ہوں اور خدائے عزیز اور رحیم پر بھروسا رکھو۔ " (الشُّعراء، آیات 114 تا 117)

اس پلان کے مطابق دعوت دین کا آغاز اپنے قریبی خاندان میں قریش سے کرنا تھا، جو لوگ دعوت قبول کرتے ان کے ساتھ شفقت و محبت کا معاملہ کرنا اور ان کو کفار کے نرغے سے نکالنا تھا۔ بعد کے مرحلہ میں دعوت کو پورے زور قوت کے ساتھ بلند آہنگ ہو کر پیش کرنا اور شرک پر جمع ہوئے ان لوگوں سے، جو آپ کی بات نہ سنے، اعلان برات کرنا تھا۔ اس پورے کام میں ہدایت تھی کے آپ اللہ پر بھروسہ کریں جو زبردست اور اپنے ارادوں کو بروئے کار لانے پر قادر ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کام کا آغاز بالکل فطری انداز میں الاقرب فالأقرب کے اصول پر کیا۔ یعنی اپنے قریب ترین لوگوں سے آغاز کر کے آپ ان لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے جو پہلوں کے بعد قریب ترین تھے۔ سب سے پہلے آپ نے اپنی نئی ذمہ داری سے اپنی اہلیہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا، کو آگاہ کیا جو پہلے ہی سے آپ کے عقیدہ و عمل کی مداح، اور آپ کی رسالت کی خبر کی منتظر تھیں، انہوں نے فی الفور آپ کی دعوت قبول کیا۔ اس کے بعد یہ بات آپ کے باقی اہل خانہ کے علم میں آئی۔ ان میں سے آپ کی بیٹیوں زینب اور رُقیہ اور آزاد کردہ غلام و متبنی زید بن حارث نے اسلام قبول کیا۔ حضور کی تیسری اور چوتھی صاحب زادیاں، اُم کلثوم اور فاطمہ ابھی کم سن تھیں۔ قاضی سلیمان منصور پوری کی تحقیق کے مطابق تو حضرت فاطمہ کی ابھی ولادت نہیں ہوئی تھی اور حضرت علی، جو آنحضرت کی تولیت میں تھے، صرف آٹھ سال کے تھے اور ابھی سن شعور کو نہیں پہنچے تھے۔ بہر حال یہ صاحب زادیاں اور

حضرت علی اسلام کی آغوش میں پلے بڑھے اور سِن شعور کو پہنچ کر انہوں نے اسلام ہی کو اوڑھنا بچھونا بنایا ۔

گھر سے باہر حضرت کے دوستوں ، قد دانوں اور مداحوں کا ایک وسیع حلقہ تھا۔ آپ نے اُن پر توجہ دی۔ جوں جوں وہ اسلام کی تعلیم کے قائل ہوتے گئے ، نہ صرف خود حلقہ بگوش اسلام ہوئے بلکہ اپنے اپنے اہل خانہ یا دوستوں کو بھی اس دین میں لانے کا ذریعہ بنے۔ ان کا تعلق قریش کے سبھی خاندانوں سے تھا۔ اس کا اندازہ سابقون اولون (مے یعنی شروع ہی میں ایمان لانے والوں کی فہرست سے لگایا جاسکتا ہے جو سیرت کی کتابوں میں ملتی ہے۔ ہم قریش کے خاندانوں کے حوالہ سے اسے یہاں نقل کرتے ہیں:

بنو ہاشم : جعفر بن ابی طالب مع زوجہ اسما بنتِ عمیس

بنو مطلب :عبیدہ بن الحارث

بنو عبدشمس:عثمان بن عفان

خالد بن سعید بن الحاص

سلیلط بن عمرو

ابوحذیفہ بن عتبہ بن ربیعہ

بنواسد: زبیر بن العوام

خدیجہ بنت خویلد، زوجہ رسول اللہ

بنو مخزوم: ابوسلمہ بن عبدالاسد

عیاش بن ابی ربیعہ زوجہ اسما بنت سلامہ

ارقم بن عبد مناف

بنو تیم: عبداللہ بن ابی قحافہ (حضرت ابوبکر)

طلحہ بن عبیداللہ

اسماء بنت ابی بکر (حضرت عائشہ ابھی سِن شعور کو نہیں پہنچی تھیں)۔

بنو زہرہ: عبدالرحمن بن عوف

سعد بن ابی وقاص وعمیر ابی وقاص

خباب بن الارت (حلیف)

عبداللہ بن مسعود (حلیف)

بنو عدی :سعید بن زید مع زوجہ فاطمہ بنت خطاب

بنو حنظل: عثمان بن مظعون وقدامه بن مظعون وعبد الله بن مظعون

بنو سہم: خیس بن حذافہ

بنو اسد بن خزیمہ: عبد اللہ بن حنظل وابو احمد بن حنظل وزینب بنت حنظل

بنو حارث: ابو عبیدہ بن الحنظل

ان کے علاوہ غلاموں میں عمار بن یاسر، یاسر مع زوجہ سمیہ، عامر بن فہیرہ اور صہیب بن سنان کے نام قدیم الاسلام صحابہ کے طور پر آتے ہیں۔ سیرت کی قدیم ترین کتابوں کے مطابق نبوت کے پانچویں سال تک مسلمانوں کی تعداد سوا سو سے زیادہ ہو چکی تھی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بالکل ابتدا ہی میں قریش کے تمام خاندانوں کے اچھے افراد کو متاثر کر کے ان کے دلوں کو جیت لینے والی دعوت کیا خفیہ تھی اور اتنے لوگوں کا اسلام کیا مخفی رہ سکتا تھا کہ قریش کی لیڈر شپ کو تین سالوں تک کانوں کان خبر نہ ہوئی کہ وہ اس آنے والے سیلاب کے آگے بند باندھنے کی کوئی تدبیر کر سکتے۔

دوسرے زاویے سے دیکھیں تو قریش کے خانوادے کوئی الگ الگ جزیرے نہ تھے کہ بنو ہاشم میں پیش آنے والا ایک واقعہ بنو امیہ یا بنو اسد یا بنو مخزوم کے علم میں نہ آ سکتا۔ ان کی آپس میں رشتہ داریاں تھیں۔ آنحضرت ﷺ کی پھوپھی ام الحکیم بیضا بنو امیہ میں، پھوپھی صفیہ بنو اسد میں، پھوپھی برہ بنو مخزوم میں اور پھوپھی امیمہ بن اسد بنو خزیمہ میں بیاں ہوئی تھیں۔ عثمان بن عفان بیضا کے نواسے اور زبیر بن العوام حضرت خدیجہ کے بھتیجے اور صفیہ کے بیٹے تھے حنظل کے صاحبزادے امیمہ کی اولاد اور ابوسلمہ برہ کے بیٹے تھے۔ بنو زہرہ آنحضرت کے ننھیال اور بنو اسد آپ کے سسرال تھے۔ اتنی قریبی رشتہ داریوں میں باہمی تعلقات بے تکلف ہوتے ہیں، تمام لوگ ایک دوسرے کے احوال سے باخبر ہوتے ہیں اور کوئی بھی غیر معمولی واقعہ خفیہ نہ رہ سکتا۔ آخر رسول اللہ کی دعوت ہی تین سال تک کیسے خفیہ رہ گی؟

دعوت کو برداشت کرنے کا دور

ہمارے نزدیک رسول اللہ کی تبلیغ نہ صرف یہ کہ قریش کی لیڈر شپ کی نگاہوں کے سامنے ہو رہی تھی بلکہ ان کو مخاطب کیا جا رہا تھا کیونکہ حضور کے عشیرہ و قبیلہ وہی تھے۔ لوگوں کے قبول اسلام کی رفتار بالکل فطری تھی۔ لوگ آنحضرت ﷺ سے ملتے، آپ کا نقطہ نظر معلوم کرتے اور جیسے جیسے دعوت کے معاملہ میں یکسو ہوتے قبول اسلام کی راہ میں کوئی چیز سد را نہیں بنتی تھی۔ آغاز کار میں بوجہ قریش کے لیڈروں نے حضور کی مخالفت میں کوئی قدم نہیں اٹھایا بلکہ دعوت توحید کو برداشت کیا۔

اس لیے لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ کیا حضرت کی دعوت کا خفیہ دور تھا۔ قریش کے اس رویہ کے بظاہر تین اسباب سمجھ میں آتے ہیں:

اولاً: اللہ تعالیٰ کا پیغام اپنے رسول پر ایک تدریج کے ساتھ نازل ہوا۔ ابتدا میں اس کا ہدف دلوں کے اندر نیکی کے فطری داعیہ کو ابھارنا اور معاشرتی برائیوں کے خلاف نفرت پیدا کرتا تھا۔ اس میں خدا سے شکرگزاری کے تعلق بندوں کے حقوق کے شعور، غرباء پروری، مسکینوں کی دستگیری، یتیموں پر شفقت اور مکارم اخلاق کو تعلیم کا مرکزی نقطہ بنایا گیا تھا۔ مثال کے طور پر کچھ آیات ملاحظہ ہوں:

ترجمہ:

ہرگز نہیں ، بلکہ تم یتیموں کی قدر نہیں کرتے ،مسکینوں کو کھانا کھلانے پر ایک دوسرے کو نہیں ابھارتے ، وراثت کو سمیٹ کر ہڑپ کرنے اور مال کے عشق میں متوالے ہو۔

ترجمہ:

کیا ہم نے (انسان) کو دو آنکھیں نہیں دیں ، اور ایک زبان اور دو ہونٹ نہیں دیئے ، اور اس کو دونوں راہیں نہیں سمجھا دیں: پر اس نے گھاٹی نہیں پار کی ۔ اور تم کیا سمجھے کہ کیا ہے وہ گھاٹی گردن کو چھڑانا یا بھوک کے زمانہ میں کسی قرابت دار یتیم یا کسی خاک آلود مسکین کو کھلانا۔ پھر وہ بنے ان میں سے جو ایمان لائے اور جنہوں نے ایک دوسرے کو صبر اور ہمدردی کی نصیحت کی۔

ترجمہ:

تمہاری سرگرمی کے ثمرات الگ الگ ہیں ۔ سو جس نے انفاق کیا اور پرہیزگاری اختیار کی اور اچھے انجام کو سچ مانا اس کو تو ہم پہلے بتائیں گے راحت کی منزل کا اور جس نے بخل کیا اور بے پروا ہوا اور اچھے انجام کو جھٹلایا اس کو ہم ڈھیل دیں گے کٹھن منزل کے لیے۔

تمام اچھے اہل عرب ان اعلیٰ مقاصد کے ہمیشہ سے خوگر تھے جن کی تعلیم قرآن دے رہا تھا۔ اس تعلیم سے شرفائے قریش کے دلوں میں کوئی کھٹک نہیں پیدا ہوئی۔ انہوں نے اس دعوت کو ایک مقبول و ہر دل عزیز مصلح کی ایک قابل قدر سرگرمی قرار دیا۔

ثانیا: قریش کے اندر دین حنیف کے ماننے والوں کی ایک روایت پہلے سے موجود تھی ۔ ان لوگوں کی تعداد اگرچہ زیادہ نہ رہی ہو لیکن یہ لوگ عین خانہ کعبہ کے سایہ میں اپنے عقائد کا برملا اظہار کرتے اور معاشرہ ان لوگوں کو برداشت کرتا تھا۔ نبی ﷺ حنیف تو تھے ، آپ معاشرے کے سب سے زیادہ باکردار، مکارم اخلاق کا پیکر حسن عمل کا نمونہ، مہجسم صداقت و امانت اور حق نصیحت ادا کرنے والے بھی تھے۔ قوم آپ کی قدردان اور آپ پر اعتماد کرتی تھی۔ آپ نے دین کی دعوت دینا شروع کی تو وہ آپ کے

اسی کردار کو مزید نمایاں کرنے والی تھی۔ لہذا قریش کو ابتدا میں اس دعوت سے کوئی وحشت نہیں ہوئی۔ یہ اسی طرح کی صورت حال تھی جیسے حضرت ابراہیم اپنے والد اور قوم کو بتوں کی پوجا سے منع کرتے رہے تو قوم ان کی راہ میں مزاحم نہیں ہوئی حتیٰ کہ جب انہوں نے بتوں کو توڑ ڈالا اور بتوں کے پجاریوں نے قیاس آرائی شروع کی کہ یہ کارروائی کس شخص کی ہوسکتی ہے تو انہوں نے یقین کے ساتھ ابراہیم علیہ السلام کا نام نہیں لیا بلکہ محض گمان کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

ترجمہ:

ایک نوجوان کو جس کا نام ابراہیم ہے، ہم نے ان بتوں کا (برا) ذکر کرتے سنا ہے۔ یعنی یہ شخص چونکہ بتوں کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار مخالفانہ انداز میں کرتا رہا ہے لہذا ممکن ہے اسی نے یہ حرکت کی ہو۔ رسول اللہ کی دعوت کے جب وہ تقاضے سامنے آئے جن کی زد قریش کے مفادات پر پڑتی تھی اور انہیں اپنے مذہبی نظام میں دراڑیں پڑنے کا خطرہ محسوس ہوا تب انہوں نے نبی ﷺ اور آپ کی دعوت کے معاملہ میں رویہ تبدیل کیا۔

ثالثاً: عربوں کی زندگی قبائلی تھی۔ ہر خاندان اپنے افراد کا بھی خواہ اور محافظ ہوتا تھا۔ دوسرے قبائل اور خاندانوں کے لوگ کسی غیر خاندان کے فرد کو نقصان پہنچانے سے پہلے سو بار سوچتے تھے کہ اس فرد کے خاندان کے جذبہ انتقام کو کیسے ٹھنڈا کریں گے اور ان کے نقصان کی تلافی کی کیا صورت ہوگی۔ قریش کے اندر جب اسلام قبول کرنے والوں پر تشدد کرنے اور دعوت دین کو زور و قوت سے کچل دینے کا خیال پیدا ہوا تو بار بار یہی سوال سامنے آتا رہا کہ متاثرین کے خاندانوں کا مقابلہ کرنے کی سکت بھی کسی میں ہے یا نہیں۔ عرب قبائل میں اپنے افراد کا ساتھ دینے اور ان کے ساتھ زیادتی کا انتقام لینے کی روایت اس قدر مستحکم تھی کہ بعد میں جب یثرب کے قبائل اوس اور خزرج نے اسلام قبول کیا اور حضرت ﷺ کو اپنے ہاں لے جانے کی پیشکش کی تو اس سے پہلے آپ سے یہ یقین دہانی حاصل کی کہ ان قبائل کے ان افراد کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا جو یہودیت اختیار کر چکے ہیں۔ چنانچہ حضور نے ان یہودیوں کے وہی حقوق تسلیم کیے جو اسلام لانے والوں کے وحی حقوق تسلیم کیے جو اسلام لانے والوں کے تسلیم کیے۔

قریش کو انذار کا حکم:

نبی ﷺ کی دعوت اسلام کو برداشت کرنے کا یہ دور عارضی تھا۔ جلد ہی بیت اللہ کے متولیوں پر قرآن میں تنقید ہونے لگی اور ان کی کوتاہیوں کا پردہ چاک ہونے لگا تو ان کا رویہ بھی بدل گیا۔ انہوں نے رسول اللہ کی بر ملا مخالفت شروع کر دی اور دعوت کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کرنے لگے۔ قرآن میں نبی ﷺ کو یہ ہدایت ملی کہ اپنے قرابت مند خاندان کو انذار کرو۔ انذار کا مطلب یہ تھا کہ ان کو خبردار کرو کہ وہ اپنی

حرکتوں کو چھوڑ کر اسلام کی تعلیم کو قبول کریں ورنہ اللہ تعالیٰ کی پکڑ کے لیے تیار رہیں۔ جس سے چھڑانے والا اور اللہ کے عذاب سے پناہ دینے والا کوئی نہ ہوگا۔ قرابت مند خاندان سے مراد بنو ہاشم ہی نہیں بلکہ وہ تمام خاندان بھی تھے جن کا تعلق خانہ کعبہ کے نظم و نسق، اس کی حفاظت و خدمت اور مذہبی رسوم ادا کروانے سے تھا یعنی قریش کے تمام خاندان۔ انذار کی ہدایت کا مقصد یہ تھا کہ اللہ کے گھر کے یہ متولی اور ناظمین اس سے فائدہ اٹھائیں اور اپنی اصلاح کر کے دوسرے عربوں کے لیے قبول اسلام کی راہ کھولیں کیونکہ دین کے معاملہ میں یہ ان کے مذہبی پیشوا ہیں۔ اگر یہ طبقہ کسی طرح دعوت کو قبول کرنے پر آمادہ ہو جائے تو دوسرے لوگ بہ آسانی ان کی پیروی میں دعوت کو قبول کر لیتے ہیں۔ اور جب تک یہ طبقہ دعوت کو قبول نہ کرے تو یہ عوام الناس کو اپنے مشوروں اور نصیحتوں کے ذریعے دعوت کی مخالفت اور بیخ کنی پراکساتا رہتا ہے۔

یاد رہے کہ حضرت ابراہیم نے خانہ کعبہ اللہ واحد کی عبادت کے مرکز کے طور پر بنایا تھا اور اپنی اولاد کو اس میں نماز، طواف، اعتکاف، حج اور قربانی کی سہولتیں مہیا کرنے اور زائرین کی خدمت کرنے کا فریضہ سونپا تھا۔ لیکن اب صورت حال یہ تھی کہ اولاد ابراہیم بیت اللہ کے اندر شرک کو تحفظ دینے اور توحید کی آواز دبانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اگر یہ لوگ حضور ﷺ کی دعوت کو قبول کر لیتے تو بیت اللہ کے نظام کو اس کی اصل شکل میں قائم کرنا ممکن ہوتا جس کی آرزو ابراہیم نے کی تھی اور جس کے لیے درد دل کے ساتھ دعائیں کی تھیں۔

قرآن کی مذکورہ ہدایت پر عمل کرنے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں ہر ممکن طریقہ اختیار فرمایا وہیں عربوں میں مروج طریقہ اپنایا۔ ان کے ہاں یہ روایت تھی کہ اپنے دشمنوں کی غارت گری سے محفوظ رہنے کے لیے وہ اپنی بستی کے قریب کسی ٹیلہ پر ایک دید بان مقرر کر دیتے جو چاروں طرف نگاہ رکھتا۔ اگر دیدبان کبھی خطرہ محسوس کرتا تو یا صبحاہ کا نعرہ بلند کرتا جس کا مطلب ہوتا کہ غارت گری کا خطرہ ہے۔ لوگ آواز سنتے ہی گھروں سے نکل کر بھاگتے ہوئے اس کے پاس آتے اور خطرہ کی نوعیت پوچھتے۔ اگر حملہ ہونے والا ہوتا تو وہ اپنے ہتھیار لگا کر میدان میں آ جاتے۔ رسول اللہ ﷺ نے جب ایک کوہ صفا پر کھڑے ہو کر یہی نعرہ لگایا تو لوگوں نے حیرت سے ایک دوسرے سے پوچھا کہ یہ نعرہ کون لگا رہا ہے۔ جب معلوم ہوا کہ میر محمد (ﷺ) کی آواز ہے تو قریش کے عام و خاص صفا کے پاس جمع ہو گئے۔ آپ نے ان کو مخاطب کر کے فرمایا کہ میں ایک نذیر (یعنی خطرہ سے خبردار کرنے والا) ہوں۔ میری اور تم لوگوں کی مثال اس آدمی کی ہے جو دشمن پر نظر رکھنے کے لیے اپنے قبیلہ کی دیدبانی کرتا ہے۔ پھر جب ڈرتا ہے کہ دشمن کہیں ان تک پہنچ نہ جائے تو یا صبحاہ کا نعرہ بلند کر دیتا ہے۔ (میں ایک آنے

والے سخت عذاب سے ڈرانے والا ہوں۔ اے بنو کعب بن لوی ، اپنے آپ کو دوزخ سے بچاؤ۔ اے بنو مرہ بن کعب ، اپنے آپ کو دوزخ سے بچاؤ۔ اے بنو عبد شمس ، اپنے آپ کو دوزخ سے بچاؤ۔ اے بن عبد مناف، اپنے آپ کو دوزخ سے بچاؤ۔ اے بنو ہاشم اپنے آپ کو دوزخ سے بچاؤ۔ اے بنو عبد المطلب اپنے آپ کو دوزخ سے بچاؤ۔ میں اللہ کے ہاں تمہارے لیے کوئی اختیار نہیں رکھتا ۔ البتہ تمہارے ساتھ میرا رحمی رشتہ ہے سو میں اس کا حق ادا کرتا رہوں گا ۔ اس موقع پر واحد آواز جو آپ کے خلاف اٹھی وہ ابولہب کی تھی جس نے کہا

ترجمہ:

(غارت ہو، کیا اسی لیے تم نے ہمیں بلایا تھا؟)

دو بارہ آپ نے انذار کی ہدایت پر عمل کرنے کی یہ تدبیر اختیار کی کہ تمام قرابت داروں کو کھانے پر بلایا۔ جب لوگ کھانے سے فارغ ہوئے تو آپ نے ان سے خطاب کر کے اپنی دعوت پیش کرنا چاہی لیکن ابولہب آپ کی تقریر میں مغل ہو گیا اور لوگوں سے کہا کہ اب یہ شخص تم پر اپنا جادو چلانا چاہتا ہے۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور اس کے ساتھ دوسرے لوگ بھی منتشر ہو گئے ۔ اس طرح حضور ﷺ کو دعوت پیش کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ البتہ نبی ﷺ نے برملا انذار کے مضمون کو عوام میں بیان کرنا شروع کر دیا، جس سے قرشی لیڈر چیں بہ بجبین ہوئے۔
